خطیب اعظم

خطیب منبر حسینی

علامہ عقیل الغروی صاحب قبلہ

خطابت: ایک مستقل صنف ادب ہے اور ''منبر'' ایک، مقام سخن، اور یہ کس قدر تاسف کی بات ہے کہ نہ اہل ادب میں شاعری اور نثر کے دوسرے مختلف اصناف کے مقابلہ میں خطابت پر کوئی خاص توجہ کی، نہ ہی عام طور پر سخنوروں نے ''فراز منبر'' کی صحیح شناخت کی اور دونوں گروہوں کی اکثریت۔ ''دار'' و ''فراز دار'' سے آگے نہ بڑھی حالانکہ، صلیب و دار کے استعارے اپنی حقیقتوں کے ساتھ کب کہنہ ہوئے بلکہ حلاج ناحق نعرۂ انا الحق سے جڑ کر ''سخن حق اور حق سخن'' کی راہ و روایت سے بیگانے ہوئے۔

خطابت واقعاً بجائے خود ایک مستقل صنف ادب ہی نہیں بلکہ ادبیات عالم میں موجود مختلف اسالیب اظہار میں سے ایک مخصوص اور منفرد اسلوب اظہار ہے۔ ایک ایسا اسلوب جو بیک وقت ''نثر'' سے کہیں زیادہ ''نثریت'' اور ''شعر'' سے کہیں زیادہ ''ارتکاز'' رکھتا ہے! اور یہ مخصوص اسلوب اظہار چاہے کسی سبب سے ادباء کی توجہ اپنی طرف زیادہ جلب نہ کر سکا ہو، لیکن کم بیش دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے اور اپنی ادبی اور فنی ماہیت کے اعتبار سے انتہائی دقیق بحث و بررسی کا مستحق ہے۔

''منبر'' وہ مقام سخن ہے جس کی اپنی ایک ذاتی صفت بلندی ہے اور وہ بھی ایک ایسی بلندی جس کو محض مکانی مفہوم میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ بلندی ایک سیال معنوی حقیقت رکھتی ہے۔ یعنی یہ منبر کی اپنی ذاتی صفت ہونے کے باوجود اپنے اہل عناصر کی طرف منتقل بھی ہوتی ہے اور با تمام معنی منتقل ہوتی ہے یہ انتقال البتہ اہل عناصر کے درجۂ اہلبیتؑ کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

دنیا کی بے شمار مختلف زبانوں اور تہذیبوں میں عربی زبان اور ''ہاشمی ابراہیمی تہذیب'' نے خطابت و منبر کی تقریب سے انسانی ادبیات کو بالعموم اور اسلامی ادبیات کو بالخصوص خطات کی ایک اور خاص اور بسا بہتر و برتر صنف ''ذاکری'' سے روشناس کرایا۔ یہ وہ خطابت تھی۔ اور ہے جو منبر کی نشست اور ''وحی'' کی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ ''عام خطابت'' کی بہ نسبت اس خاص خطابت کی اہمیت کا اندازہ اور تجزیہ اور بھی زیادہ سنجیدہ، عمیق اور وسیع مطالعہ کا مستحق ہے۔

یہ مختصر تقریب کلام خطابت، منبر یا ذاکری۔ ان میں سے کسی ایک سے متعلق بھی کسی فنی بحث و بررسی کی متحمل نہیں۔ یہ چند اشارات صرف خطیب منبر حسینی، خطیب آل محمدؑ، ملک الناطقین، فخر المتألہین شمس العلماء، مولانا سید سبط

حسن صاحب قبلہ جائسی ثم لکھنوی مرحوم و مغفور متخلص بہ، فاطر، کے ترجمۂ حیات کی تمہید کے طور پر پیش کئے گئے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ جب ابھی تک خطابت وذاکری کے اصناف پر کماحقہ کام نہیں ہو سکا تو ان اصناف میں اپنا لوہا منوانے والوں کی صلاحیتوں، محنتوں اور ان کی عظمتوں کا اندازہ کہاں تک کیا جا سکتا ہے؟ اور پھر اس شخص کی ''عبقریت'' کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جسے دنیا نے ''خطیب آل محمدؑ'' اور ''خطیب اعظم'' کے القاب سے نوازا۔

خطابت و ذاکری کی فنی ماہیت اور اس کے مشکلات سے قطع نظر خطابت کی عملی دشواریوں کا اندازہ کرنے اور بطور خاص منبر کی اہلیت کی ایک ذرا سی شناخت کے لئے عربی زبان کے چند مشہور علام کے بعض واقعات خطابت یا سانحات خطابت کا تذکرہ کافی ہوگا۔

جاحظ کی روایت ہے کہ عثمان منبر پر چڑھے (اور چڑھے کیا کہ آپ ہی اپنے چڑھنے کا سامنا کیا۔ لرز گئے۔ یا یہ کہ انہیں بولنا مشکل ہو گیا۔ تو بس اتنا کہہ کر اتر آئے کہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوبکر وعمر اس مقام ''منبر'' کے لئے مقامات یا تقریریں تیار کیا کرتے تھے اور تم لوگ تو ایک امام خطیب کی بہ نسبت ایک امام عادل کے زیادہ محتاج ہو۔ اور عنقریب تمہارے سامنے اپنے انداز کے خطبے پیش کئے جائیں گے (گویا پوری تیاری کے ساتھ) اور پھر تم لوگ جان جاؤ گے۔ (شاید اس آخری فقرے کا مطلب یہ ہو کہ پھر تم لوگ جان جاؤ گے کہ میں تیاری کے بعد کیسے خطبے سنا سکتا ہوں۔)

اسی طرح یعقوبی کا بیان ہے کہ جب ابوالعباس سفاح کی بیعت ہوئی اور اس نے خطبہ دینا چاہا تو خطبہ دینا اس کے لئے دشوار ہو گیا اور اس کے بدلے اس کے چچا داؤد بن علی نے خطبہ دیا۔ ابن ابی الحدید نے داؤد بن علی کے بھی اس موقع کے خطبہ کو صرف اس قدر نقل کیا ہے کہ اس نے کہا لوگو! امیر المومنین (کذا) تمہارے سامنے اپنے عمل سے پہلے اپنا قول پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے اس لئے کہ عمل تمہارے اوپر خطبہ بیان کرنے سے زیادہ اثرانداز ہوگا۔ اور تمہارے لئے کتاب خدا برائے علم کافی ہے اور رسولؐ خدا کے چچا کی اولاد تمہارے اوپر حکومت کے لئے کافی ہے۔

ان دونوں واقعات یا سانحات سے بھی شگفتہ تر واقعہ روح بن حاتم کا ہے، جسے ابوالحسن مدائنی نے نقل کیا ہے۔ جب روح بن حاتم منبر پر گیا تو لوگوں نے دہشت اور تعجب کی نظر سے اسے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا اور اس کی تقریر سننے کے لئے گوش برآواز ہو گئے۔ تو روح بن حاتم نے کہا: لوگو! اپنے سروں کو نیوڑھا لو اور اپنی آنکھیں جھکا لو اس لئے کہ منبر بڑی سخت سواری ہے۔ (اب اس آخری فقرے پر کیا تبصرہ کیا جائے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''منبر ایک بڑی سخت سواری ہے۔۔۔'')

اس قسم کے واقعات دوسری زبانوں کی تاریخ خطابت میں بھی ضرور ہوں گے، لیکن عربی زبان کے حوالے صرف اس لئے پیش کئے گئے کہ دنیا کی دوسری قوموں اور زبانوں کی بہ نسبت عربی قوم ایک خاص صورت حال کی بنا پر

شاعری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی تقریباً دوسری تمام قوموں پر فوقیت رکھتی ہے یہ خاص صورت حال کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا عربوں کی ایک امتیازی صفت اور نا قابل معذرت کمی اور کمزوری سے تشکیل پاتی ہے۔امتیازی صفت یہ کہ ''ناموس سخن'' سے بے حد کمال فطری مناسبت و وابستگی خصوصاً اس دور جو نزول قرآن سے شروع ہو کر اس کے ذرا بعد تک جاری رہتا ہے، جتنی عربوں کی نصیب میں آئی اتنی کسی دوسری قوم یا زبان والوں کے نصیب میں نہیں آئی۔دوسری طرف نا قابل معذرت کمی اور کمزوری اس قوم کے فن تحریر سے بالعموم ناواقفیت۔جو عین اسی دور میں نظر آتی ہے ان دونوں عوامل نے مل کر اس قوم کو اگر نثر نگاری کے میدان میں بہت پیچھے رکھا تو دوسری طرف شاعری اور خطابت کے میدان میں اس حد تک پہونچا دیا کہ دوسری قومیں اور دوسری زبان والے ان سے کہیں پیچھے رہ گئے۔آخر ''شعور سخن'' کی کسی نہ کسی صورت میں نمود تو ہونی ہی تھی۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے جس قوم کے فرد فرد میں شاعری اور خطابت فطری استعداد موجود تھیں اسی قوم میں ایسے سانحات خطابت اور پھر ایسے اعلام کے، کہ جن میں کچھ نہ سہی لیکن واقعاً ''جرأت رندانہ'' (ادبی اصطلاح میں شاید اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جا سکے) تہور کی حد سے بھی سوا تھی، یہ اسی نکتہ کو پیش کرتے ہیں کہ خطابت کے فنی اور عملی عناصر، مسائل اور مشکلات واقعاً شاعری سے بھی پیچیدہ تر ہیں اور اس میدان کا مرد بننا چنداں آسان نہیں۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو ہندوستان کے گزشتہ مدرسۂ اجتہاد کے آخری ستون فقیہ اعظم مفتی احمد علی صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کا یہ قول صراحتاً مبالغہ ہونے کے باوجود کتنا واقعیت و حقیقت سے نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ ''واقعہ تو یہ ہے کہ بنی آدم میں ایسا شخص پیدا نہیں ہوا'' اور ایسے شخص سے ان کی مراد تھی اسی شخصیت سے کہ جس برصغیر کے اسلامی مکتب فکر و مدرسۂ دانش وفرہنگ میں علی الاطلاق ''خطیب آل محمدؐ'' اور ''خطیب اعظم'' کے القاب سے جانا جاتا ہے۔یعنی شمس العلماء۔لسان المتألہین ملک الناطقین سید سبط حسن فاطرؔ صاحب ''معراج الکلام''

حقیقت یہ ہے کہ جناب ''خطیب اعظم'' کی شخصیت ہند و سندھ کے اعلیٰ و ادبی افق پر ابھرنے والی وہ تحریر تھی جس کی علمی وفکری تہہ داری و تخلیقی وفنی پرکاری انتہائی عمیق اور وسیع مطالعہ و بررسی چاہتی ہے۔کاش! کوئی جیالا ان مغفور پر مستقل تحقیق کا بیڑا اٹھاتا اور لکھنؤ یونیورسٹی یا کسی بھی یونیورسٹی سے ان پر کوئی پی۔ایچ۔ڈی یا ڈیلٹ کا کام سامنے آتا۔

ان کا اصل وطن رئیس المتألہین سید الطائفہ آیۃ اللہ علی الاطلاق سید دلدار علی غفرانمآب طاب ثراہ صاحب ''عماد الاسلام'' کے وطن و مولد قصبہ نصیر آباد سے ملا ہوا قصبہ جائس (ضلع رائے بریلی) تھا اور ان دونوں بزرگوار کا جدی سلسلۂ نسب ایک ہی تھا (رحمہما اللہ) ان کے والد کا نام سید وارث حسین نقوی تھا۔۱۲۹۶ھ میں جائس میں ولادت ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی کہ اہل خاندان اور اہل قصبہ بجائے خاصے با فضل تھے۔پھر

تکمیل علم کے لئے لکھنؤ کا رخ کیا

فروغ طبع خدا داد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

کے بمصداق اس وقت کے فحول علماء آیۃ اللہ مؤسس نجم الملۃ والدّین سید نجم الحسن صاحب قبلہ الرضوی الامروہوی ثم الکھنوی۔ اور فقیہ اہل بیتؑ مرجع کبیر آیۃ اللہ العظمیٰ سید باقر صاحب قبلہ اور اس وقت کے دیگر اساتذہ سے کسب فیض کیا اور خود اپنے اساتذہ کی نظر میں وہ مقام پیدا کیا کہ جب آیۃ اللہ مؤسس جناب نجم الملت صاحب طاب ثراہ نے ''مدرسۃ الواعظین'' کی تاسیس وتشکیل فرمائی تو انہیں اس کا صدر مدرس قرار دیا۔

اگرچہ بالآخر ان کی شہرت ان کی خطابت یا پھر شاعری اور دوسری ادبی حیثیتوں سے باقی رہی لیکن ان کے تعلیمی مرحلہ زندگی کے تذکرہ میں ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبع داری نے تعلیمی مرحلہ میں ہی فقہ واصول فقہ کے میدانوں میں بھی ایک خاص امتیاز عطا کر دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ زمانہ لکھنؤ کے مدارس کا وہ تھا کہ جس میں آخری درجات یعنی ممتاز الافاضل وصدر الافاضل کے امتحانات کے پرچے اساتذۂ حوزہ علمیہ نجف بنا کر بھیجا کرتے تھے اور امتحانات کی کاپیاں بھی شبر واختبار کے لئے وہیں جایا کرتی تھیں ''خطیب آل محمدؐ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ جب جناب سبط حسن صاحب قبلہ کے اصول وفقہ کی کاپیاں نجف پہونچیں تو وہاں ممتحن نے ان کے جوابات اپنی مجلس درس میں پڑھ کر سنائے اور اپنے شاگردوں کو ویسی استعداد پیدا کرنے کی ترغیب دلائی حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ معمولی نہیں۔

بطور خاص ان کی خطابت کے تعلق سے اس مختصر تقریب کلام میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ خطابت کے عام فنی عناصر اور علمی وعملی لوازم کے ساتھ بظاہر ان کے یہاں پانچ عناصر مستزاد تھے۔

۱۔ عربی شعر وادب کے وسیع مطالعہ سے تشکیل پانے والا ان کا خاص ذوق اور زاویۂ نظر جو آیات قرآن مجید اور ارشادات معصومینؑ کے ترجمہ وتجزیہ میں عام مترجمین و شارحین کی بہ نسبت کہیں زیادہ افادات پیش کرتا تھا۔

۲۔ اردو زبان پر ان کا خلاقانہ تصرف جو ان کے افادات کو خاص وعام ہر طبقہ کے ان کے سامعین کو ہر طرح مطمئن اور محظوظ کرتا تھا۔

۳۔ فلسفہ وکلام واصول فقہ کے اسالیب بحث پر ان کا تسلط جو ان کے افادات (یا نکتوں) کو علمی اور فکری معیار سے گرنے نہیں دیتا تھا۔

۴۔ مطالب کی ادائیگی میں الفاظ ومعنی کے بیشتر مناسبات کا لحاظ رکھتے ہوئے لہجے اور اشارات کے زیر وبم سے نامحسوس کو محسوس بنا دینے والا ان کا اپنا انداز خطابت۔

۵۔ اور سب سے اہم اور سب سے موثر عنصر ''منبر حسینیؑ'' کی عظمت کا احساس اور اس سے ان کا خلوص۔ جیسے کسی بھی ''ذاکر'' کی کامیابی کی پہلی اور آخری شرط سمجھنا چاہئے۔

☆☆☆